ہیں۔ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے بارے میں کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ لفظوں کا سودا بیچتے ہوئے وہ ڈنڈی نہیں مارتے اور ڈنڈے کا سہارا نہیں لیتے۔ وہ اعتدال پسند ہیں اور دلیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ اسی لیے سچ بولتے ہوئے کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا شمار وضع داروں کی اُس نایاب نسل میں کیا جا سکتا ہے جو مصلحت اور نعرہ بازی کا شکار نہیں ہوتی اور اشیاء اور واقعات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھتی ہے۔

وہ دن بھی کیا دن تھے کہ ایسی شخصیات ڈھونڈے بغیر مل جاتی تھیں۔ اب تو ڈھونڈنے پر اگر کچھ ہاتھ آتا ہے تو وہ کسی امپورٹڈ بیٹری سے چلنے والا روبوٹ ہوتا ہے۔

مَیں اور مَیں اور مَیں یعنی مَیں مَیں مَیں مَیں۔

میرے خیال میں، مَیں کے ساتھ تُو کا شامل ہونا بھی ضروری ہے اور اسی طرح کے طریقۂ اظہار کو معقول اور صائب کہا جا سکتا ہے۔

اپنے سفرنامے ''کشورِ کسریٰ تا سونار دیس'' کے صفحہ ۱۴۶-۱۴۷ پر مختصر انداز میں ہماری موجودہ صحافت کو آئینہ دکھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے روزانہ کی بنیاد پر ''تماشا گری'' کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ اخبار زیادہ بِکنا چاہیے۔ بکنا اور بِکنا میں حروف وہی ہیں۔ فرق زبر زیر کا ہے۔ اس واقعے کا امجد اسلام امجد نے اسی کتاب کے دیباچے میں بھی ذکر کیا ہے۔

> ''مجھے یہ تقریر (شاہین رسول کی) پڑھ کر سیالکوٹ کا وہ بارہ سالہ عیسائی لڑکا یاد آ گیا جس کا ظہور پاکستانی افق پر اچانک بطور ''لیڈر وصدر'' پاکستان قالین بافی مزدور یونین ہوا۔ حقوقِ انسانی کے علمبرداروں نے دو ہی دن میں ''جلوسوں'' اور اخباروں کے ذریعہ بچوں سے مزدوری اور اُن پر ظلم (چائلڈ لیبر) کے خلاف وہ آواز بلند کی کہ اُس کے اوج کا ستارا عرش کی بلندیوں کو چُھونے لگا، اور پھر ایک ہفتے سے بھی کم عرصے میں ''جان کے خطرے'' کی وجہ سے اُس کا پاسپورٹ بھی بن گیا۔ امریکن ویزا بھی حاصل ہو گیا اور ایک معقول رقم بھی ڈالروں کی شکل میں اُس کی جھولی میں پڑ گئی۔ اور وہ پاکستان میں ساری لیڈری اور صدارت چھوڑ کر (یقیناً اپنے والدین کے ہمراہ) امریکہ رفو چکر ہو گیا۔ حقوقِ انسانی کے علمبردار بھی کہیں غائب ہو گئے اور پاکستان بے چارے کی اربوں کی قالین بافی کی صنعت اور ہزاروں کارکنوں کا روزگار نجانے کتنے عرصے کے لئے ختم ہو گیا''۔

اس اقتباس کے نقل کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہماری موجودہ صحافت کن نئے نئے معیاروں کو چھونے لگی ہے۔ ایسے واقعات تسلسل کے ساتھ میڈیا میں آتے ہیں اور ان کا آنا ضروری بھی ہے مگر بِک سکنے والی خبر میں دیانت داری اور سچائی کا پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے۔ ایسی مثالیں کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ میڈیا کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں بھی آئی ہیں مگر

تصویر کے دونوں رُخ دکھانا بھی ضروری ہے۔اب جب کہ صحافت کا روایتی کردار وقت کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک بدل چکا ہے۔بدنامِ زمانہ ہٹلر کے الفاظ بھی الہامی لگنے لگے ہیں۔ایک ملک کی روایات جدیدیت (ڈریکولا) کا چولہ اوڑھ کر دوسرے ملکوں پر حملہ آور ہونے لگی ہیں۔بہت احتیاط کے باوجود تازہ ہوائیں نئی وبا ہیں بھی ساتھ لے آتی ہیں۔

سارے انسان برابر سہی، خون کا رنگ ایک سہی مگر ہر انساں کا خون ہر انسان کو عطیہ نہیں کیا جا سکتا۔انتقالِ خون سے پہلے ڈاکٹر مریض اور خون کا عطیہ کرنے والے کے خون کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی انتقالِ خون کا فیصلہ کرتا ہے۔ایک عام صحافی اور ایک لکھاری صحافی میں یہی فرق ہے کہ وہ اس فرق کو سمجھتا ہے۔

یہی فرق صحافت اور زرد صحافت میں تفریق کرتا ہے۔وہ صحافت جس میں (Sensalization) سچائی پر حاوی ہو جائے اسے زرد صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔اس ضمن میں رنگین الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا جاتا ہے۔

Breaking News یا فوری خبروں کی فراوانی نے صورتِ حال کو اور گھمبیر کر دیا ہے۔خبر کی ترسیل میں پہل اور سنسنی خیزی اس کے اہم لوازمات ہیں۔سنسنی خیزی کے مدِنظر بعض صورتوں میں جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔کاروباری مسابقت بھی خبر کا تجزیہ کرنے اور سچائی جاننے میں وقت ضائع کرنے کی مہلت نہیں دیتی۔کاتا اور لے دوڑی کی بات بڑی حد تک اس صورتِ حال پر صادق آتی ہے۔

ویسے (Breaking News) کا ڈھیلا ڈھالا ترجمہ خبر کی توڑ پھوڑ بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہر تصویر کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔کوئی کلر بلائنڈ ہو سکتا ہے۔کسی کو کسی رنگ سے الرجی ہو سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ فوری خبر فساد کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ہمیں واقعات و مشاہدات کی توضیح کرتے وقت جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

جب ہم آج کی بین الاقوامی صحافت پر نظر ڈالتے ہیں تو جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آزادئ صحافت کا نعرہ بلند کرنے والے اسلام اور پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے دوہرے معیار کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ان کے گماشتے ''بادشاہ کی بادشاہ سے زیادہ وفاداری کا مظاہرہ'' کرتے نظر آتے ہیں۔بہت سے خوش لباس بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔اس کے ردِعمل کے طور پر پاکستان اور اسلام سے محبت کرنے والوں کا طیش میں آجانا قدرتی بات ہے۔ع س مسلم ایسی باتوں کا جواب متانت اور دلیل کے ساتھ دیتے ہیں۔وہ جلد بازی اور غصے کا شکار نہیں ہوتے۔

عبدالستار نیازی ''حسنِ گفتگو'' کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ ع س مسلم کے کارناموں میں ایک اہم کام ''اہانتِ رسولؐ اور آزادئ اظہار'' کی تصنیف ہے۔اس میں مصنف نے اس کتاب میں بہائی مذہب، اس کی تاریخ اور عقائد کی قلعی کھول دی ہے۔اسی کتاب کے بارے

میں مولانا وصی مظہر ندوی رقمطراز ہیں۔

''ع س مسلم نے ''اہانتِ رسولؐ اور آزادیٔ اظہار'' میں قانونِ اہانتِ رسولؐ کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو تاریخی پس منظر کی روشنی میں جس مؤثر انداز میں بیان کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جنابِ مسلم نے کتاب وسنت کے براہینِ قاطعہ کے ساتھ ساتھ اس قانون کی ضرورت واہمیت کو اپنے عقلی دلائل سے اس طرح واضح کیا ہے کہ عقلِ سلیم رکھنے والا ہر شخص اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

بقول ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پروفیسر ایمی ریٹس جامعہ اُم القریٰ یونیورسٹی:

''ع س مسلم نے پاکستان کے چند دریدہ دہن منافقوں کے رد میں ایک فاضلانہ تحقیق پیش کی ہے''۔

اسی دریدہ دہنی اور منافقانہ سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہیومن رائٹس کے علمبرداروں کو راست فکر رکھنے والے افراد پر ڈھائے گئے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں اور ''سب اچھا ہے'' کی چادر اوڑھ کر سو جانے میں عافیت محسوس کرتے ہیں اور ''جس کا کھاؤ اس کا گاؤ'' کی جیتی جاگتی مثال بن جاتے ہیں۔

مسلم صاحب کے شارجہ والے گھر پر اندرا گاندھی کی آخری رسومات ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہوئے میں نے ان سے یہ پوچھا کہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ عمومی طور پر پاکستان کی توڑ پھوڑ کے ذمہ دار قدرتی موت نہیں مرے تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ بات صحیح تو لگتی ہے مگر اس کو کیا کہیں گے کہ حضرت ابوبکر کے علاوہ باقی خلفائے راشدین بھی قدرتی موت نہیں مرے تھے۔

یہی بات کئی سال بعد ''گلف نیوز'' میں ایڈیٹر کا نام لکھے جانے والے خطوط میں چھپی، جس میں لکھنے والے نے بنگلہ دیش کے حوالے سے کچھ یوں لکھا تھا کہ وہ افراد جن کو پاکستان توڑنے کا عام طور پر ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، وہ نہ تو خود اور نہ ہی ان کے بیٹے قدرتی موت مرے۔

اسی طرح جب یہ خبر چھپی کہ کہکشاؤں سے پرے ایک ایسا سوراخ (Hole) ہے جس میں داخل ہونے والی ہر شے جل جاتی ہے، تو میں نے اس تحقیق کا تذکرہ مسلم صاحب سے کیا اور پوچھا۔

''کیا یہ تحقیق معراج کے دوران سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں حضرت جبرائیل کی کہی ہوئی اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ مَیں اِس حد سے آگے نہیں جا سکتا کہ اس حد سے آگے جانے پر میرے پر جل جائیں گے!''

مسلم صاحب کا جواب یہ تھا کہ ہو سکتا ہے مگر قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ اور ایسی خبروں کو قرآن مجید یا احادیث پر منطبق نہیں کرنا چاہیے کیونکہ سائنس تو دریافتوں کا بتدریج اور مسلسل عمل ہے۔ آج کی دریافت کل کو غلط ثابت ہو سکتی ہے مگر قرآن مجید کی سچائی تو ابدی ہے۔ ان واقعات کے تذکرے سے مقصود مسلم صاحب کی غیر جذباتیت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

انہوں نے فعال صحافی نہ ہونے، گونا گوں مصروفیات اور اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اسلام اور پاکستان کے بارے میں دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرنے والوں کو دلیل کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں گویا وہ ایک ادارے کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان کا یہی تحقیقی کام انہیں صحافیوں کی اس صف میں لا کھڑا کرتا ہے، جس کے بارے میں میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔

مجھے یہ بات جان کے بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ ان کی ادبی اور صحافتی کردار کی بھرپور پذیرائی کی جا رہی ہے یعنی ان کی اذان "صحرا میں اذان" نہیں رہی بلکہ ان کی اذان پر لوگ کان بھی دھرنے لگے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کی وسیع پیمانے پر پذیرائی کی جائے اور اگر کوئی فرد یا ادارہ کر سکے تو یہ کتابیں اسمبلیوں کے اراکین اور "انسانی حقوق کے علمبرداروں" کو مہیا کرنے کا انتظام کرے۔

اگرچہ راست فکری عطیۂ خداوندی ہے، ہوسکتا ہے کہ دریدہ دہن منافقین اپنی کم علمی کی بنا پر تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ اس لیے، تمام حجت کرنا ضروری ہے۔ اس طرح (مسلمان) صحافیوں اور دانشوروں پر اس طرح دوہری ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے یعنی دیانت دارانہ تحقیق اور اس کا متعلقہ لوگوں تک پہنچانا۔

رب العزت ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے آمین

وَمَا عَلَینآ اِلّا البلاغ

("ابوالامتیاز ع س مسلم سیمینار" منعقدہ ۷۔ مارچ ۲۰۰۲ء
بہ اہتمام عالمی رابطہ ادبِ اسلامی، لاہور میں پڑھا گیا)

ذیشان تبسم☆

اُردو کا ایک غیر روایتی سفر نامہ

Abstract:

A. S. Muslim is one of the important literary personalities of our age. His creative period extends over half a century. He has written more than two dozen books of poetry and prose in the Urdu, Punjabi, and English Languages. His travelogues are also significant. "Kishwar-e-Kisra Ta Sonar Des"(2000) is his first travelogue in prose. It describes his experiences in Iran, Iraq, Kuwait and Bangladesh. This travelogue is distinguished from the traditional ones due to qualities such as the historical sense, the search for the civilizational roots, extra-ordinary seriousness, yearning for national revival, and decent style. The ideological defense of Pakistan and providing foundation for its solidarity are the themes especially treated in this travelogue. The present study is an effort to analyze its basic features.

سفر 'کُن' کے سرمدی نغمے کا ماحصل ہے۔ یہ حریمِ اسرار کا وہ غنائیہ ہے جو فراق و وصال کے زیر و بم سے ارتعاش پذیر ہے۔ سازِ ازل کی یہ فغاں، مقسومِ کائنات ہے اور ساعت بہ ساعت گامزن رہنا وظیفۂ حیات۔ اسی نسبت سے خرقہ پوشوں کے کٹھن مجاہدوں اور پیہم ریاضتوں کو 'سلوک' سے اور مشتاقانِ وصل و لقا کو 'سالک' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ راہِ سلوک کے نصاب کا پہلا قاعدہ ہی یہی ہے کہ ''جو قدم پڑے آگے ہی کی جانب پڑے۔ نہ کہیں ٹھہرے نہ پیچھے ہٹے۔''(۱)..... یہاں پیچھے ہٹنے والا پتھر کا بُت ہی نہیں بن جاتا، وقت کے گرد باد میں ریزہ ریزہ بھی ہو جاتا ہے گویا حیات کا سب سے بامعنی استعارہ سفر ہی ہے..... 'سفر زندگی ہے، سفر ہے حیات'۔

ابوالامتیاز ع س مسلم (پ:۸۔اپریل ۱۹۲۲ء)، اگرچہ صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے تاہم ان کی 'لمحہ بہ لمحہ زندگی'(۲) بھرپور مجاہدے اور روحانی جواں مردی سے عبارت ہے۔ مسلم صحیح معنوں میں خود ساختہ (Self Made) انسان ہیں، جنہوں نے زمانے کے سرد گرم اور حالات و واقعات کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں ہمت و حوصلے، ثابت قدمی اور صبر و استقلال سے مسافتِ حیات طے کرنے کا

☆استاد، شعبۂ اُردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

ہنر سیکھا۔ ان کے سفرِ زندگی کا آغاز تحصیلِ علم کی لگن میں بتلا بُوٹ پالش کرتے، کم سن لڑکے سے ہوتا ہے (۳) جو دورانِ سفر ہی میں خود موضوعِ علم بن گیا..... ایک روپیہ یومیہ کا دیہاڑی دار (۴) شام ڈھلنے سے پہلے، تجارت کا معروف حوالہ قرار پایا..... جان سے پیارے نیاز (۵) کی 'بے نیازی' نے لمحہ بھر کے لیے اس مسافر کو تھکن کا احساس ضرور دلایا تاہم سائنوسا (SCINOSA) (۶) کے ذریعے ہر نیاز کی نا زبرداری بھی سکھادی..... یوں حیاتِ مسلم، ہمہ جہت بھی ہے، ''قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی''۔ (۷)

ع س مسلم کی عمومی شہرت کے مذکورہ بالا چند حوالوں سے قطعِ نظر اُن کی خصوصی شناخت اور مستقل تعارف ادب ہی بنتا ہے۔ مسلم کا تخلیقی سفر نصف صدی کے قصے پر محیط ہے۔ آپ نے افسانہ نگاری سے باقاعدہ طور پر اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا (۸)..... اور پھر تقریباً ہر صنفِ ادب کی سیاحت کی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے انہیں بجا طور پر 'چودہ نکاتی جہانِ فن کا کوزہ گر' (۹) قرار دیا ہے۔

اس جہانِ فن کا ایک روشن مینارہ ان کی سفر نامہ نگاری بھی ہے۔ سفر نامہ کو خالص ادب میں شمار کرتے ہوئے اگرچہ کچھ تامّل کیا جاتا ہے تاہم اسے ادب سے بے دخل کرنے کا تصور بھی خارج از امکان ہے۔ اسی لیے بعض ناقدین درمیانی راستہ نکالتے ہوئے 'ادبی سفر نامہ' اور 'غیر ادبی سفر نامہ' کی تخصیص قائم کر لیتے ہیں۔ سفر نامہ کی ادبی حیثیت سے قطع نظر اس کی افادیت اور مقبولیت کسی بھی دوسری صنفِ ادب سے کم نہیں اور اب تو سنجیدگی سے سفر نامے کے عناصرِ ترکیبی اور تخلیقی خدوخال بھی مرتب کیے جا رہے ہیں۔ یوں مسلم دنیا میں سیر و سیاحت اور سفر نامہ نگاری کی افادیت کو بہت آغاز میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ایک زمانے میں بزرگانِ دین کے مقام و مرتبے کا تعین ان کے اسفار کی کثرت کے ذریعے ہی کیا جاتا تھا۔ بعض بزرگوں کی تو وجہِ شہرت ہی مسافرت ہے۔ اوچ شریف کے معروف سہروردی بزرگ جلال الدینؒ اپنی سیر و سیاحت کی وجہ سے 'جہانیاں جہاں گشت' کے لقب سے معروف ہیں۔ حکیم ناصر خسرو، ابن بطوطہ، ابن جبیر اندلسی اور البیرونی کے سفر نامے اپنی ہمہ گیری، معروضی تجزیوں اور اجنبی سرزمینوں کی جغرافیائی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی معلومات کی وجہ سے تاریخ کا اہم ماخذ بن گئے ہیں۔ خود اُردو میں باقاعدہ سفر نامہ کی روایت ڈیڑھ صدی سے کسی طرح کم نہیں۔

ع س مسلم تقریباً اڑھائی درجن بیرونی ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ حج و عمرہ کے علاوہ، ان میں سے بیشتر بیرونی اسفار کا محرک ان کی تجارتی ضروریات تھیں تاہم قرآنِ حکیم کا حکم 'سیروفی الارض' انہیں سب سے زیادہ مقدم رہا، اسی لیے یہ آیۂ کریمہ ان کے ہر سفر نامے میں شاملِ نظر آتی ہے۔ 'سفر وسیلہ ظفر ہے' کا مقولہ مسلم صاحب پر سو فیصد صادق آتا ہے۔ ابتدائی کاروباری مشکلات کے بعد وطنِ عزیز میں ہی کامیابیاں ان کے قدم چومنے لگی تھیں تاہم یہ شجرِ تجارت بیرونی ممالک کی آب و ہوا میں خوب برگ و بار لایا۔ (۱۰) یوں اُردو کے 'مخصوص' سفر نامہ نگار بھی اپنی 'پیشہ ورانہ ضروریات' کے تحت ملکی و غیر ملکی اسفار پر جاتے ہیں تاہم وطن واپسی کے بعد وہ اپنے سفری تجربات ایک یا ایک سے زاید سفر نامے کی صورت میں قلم بند کرنا نہیں بھولتے۔ ان 'احوالِ واقعی' پر مبنی تجربات میں جہاں رنگا رنگ مضامین کی بھرمار ہوتی ہے وہاں 'قابلِ دید' تصاویر ہر 'ذوقِ نظر' کے لیے سامانِ تحسین بن جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے معقول رائلٹی مل جائے تو ان اسفار کی مقصدیت ہر شبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ع س مسلم اس طرح کے معاملات سے مکمل بے نیاز رہے ہیں ورنہ اڑھائی درجن